(۶)

حرمت سود (سلبی پہلو)

متوازن معیشت کا جو نقشہ پچھلے باب میں پیش کیا گیا ہے اس کے بنیادی ستون چار ہیں:

(۱) آزاد معیشت چند قانونی اور انتظامی حدود و قیود کے اندر،

(۲) زکوٰۃ کی فرضیت،

(۳) سود کی حرمت،

(۴) قانونِ میراث۔

ان میں سے پہلے رکن کو کم از کم اصولی طور پر وہ سب لوگ اب درست تسلیم کرنے لگے ہیں جن کے سامنے بے قید سرمایہ داری کی قباحتیں اور اشتراکیت و فاشیت کی شناعتیں بے نقاب ہو چکی ہیں۔ البتہ اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ الجھنیں ذہنوں میں پائی جاتی ہیں جو بغیر اس کے دور نہیں ہو سکتیں کہ اسلام کے زرعی اور تجارتی قوانین مفصل طور پر مرتب کر دیئے جائیں۔ یہ چیز ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے، مگر ہم کوشش کریں گے کہ جلدی سے جلدی یہ خدمت بھی انجام پا جائے۔

زکوٰۃ کی اہمیت اب بڑی حد تک دنیا کے سامنے واضح ہو چکی ہے، اور کسی صاحب نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ اشتراکیت، فاشزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، تینوں نے اب تک سوشل انشورنس کا جو وسیع سے وسیع نظام سوچا ہے، زکوٰۃ اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی انشورنس کا انتظام کرتی ہے لیکن یہاں بھی کچھ الجھنیں زکوٰۃ کے تفصیلی احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ اور لوگوں کے لئے یہ بات سمجھنی بھی مشکل ہو رہی ہے کہ ایک جدید ریاست کے مالیات میں زکوٰۃ و خمس کو کس طرح نصب کیا جا سکتا ہے۔ اس چیز پر بھی انشاء اللہ ایک الگ رسالے میں بحث کی جائے گی۔

قانونِ میراث کے بارے میں اسلام نے تمام دنیا کے قوانینِ وراثت سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا ہے پہلے اس کی حکمتوں سے بکثرت لوگ ناواقف تھے اور طرح طرح کے اعتراضات اس پر کرتے تھے، لیکن اب

بتدریج ساری دنیا اسی کی طرف رجوع کرتی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ روسی اشتراکیت کو بھی اسکی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے[۱]۔ سب سے بڑھ کر اس نقشے کے جس رکن کو سمجھنے میں موجودہ زمانے کے لوگوں کو زحمت پیش آرہی ہے وہ تحریم سود ہے۔ اوّل تو بورژوا علم معیشت نے پچھلی صدیوں میں یہ تخیل بڑی گہری جڑوں کے ساتھ جما دیا ہے کہ سود کی حرمت محض ایک جذباتی چیز ہے، اور یہ کہ بلاسود کسی شخص کو قرض دینا محض ایک اخلاقی رعایت ہے جس کا مطالبہ مذہب نے خواہ مخواہ اس قدر مبالغہ کے ساتھ کر دیا ہے ورنہ منطقی حیثیت سے سود سراسر ایک معقول چیز ہے، اور معاشی حیثیت سے وہ صرف ناقابل اعتراض ہی نہیں بلکہ عملاً مفید اور ضروری بھی ہے پھر ایک بڑی غلط فہمی شکست خوردہ اہل مذہب میں یہ پھیل گئی ہے کہ سود کوئی قابل اعتراض چیز اگر ہے بھی تو صرف اُس صورت میں جب کہ وہ اُن لوگوں سے وصول کیا جائے جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لئے قرض لیتے ہیں، رہے وہ قرضے جو کاروبار میں لگانے کے لئے حاصل کیئے گئے ہوں، تو ان پر سود کا لین دین سراسر جائز و معقول اور حلال و طیب ہے، اور اس میں دین، اخلاق، عقل اور اصولِ علم معیشت کسی چیز کے اعتبار سے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس پر مزید وہ خوش فہمیاں ہیں جن کی بنا پر قدیم طرز کے بنیوں اور مہاجنوں کی سود خواری سے موجودہ زمانہ کے بنکنگ کو ایک مختلف چیز سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان بنکوں کا ستھرا کاروبار تو بالکل ایک پاکیزہ چیز ہے جس سے ہر قسم کا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام مغالطوں کے چکر سے جو لوگ نکل گئے ہیں وہ بھی یہ سمجھنے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں کہ سود کو قانوناً بند کر دینے کے بعد موجودہ زمانہ میں مالیات کا نظم کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم انہی مسائل کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے۔

---

۱ سوویٹ روس کے تازہ ترین قانونِ وراثت میں اولاد، بیوی، شوہر، والدین، بھائیوں، بہنوں، اور متبنیٰ کو وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ نیز یہ قاعدہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ آدمی اپنا ترکہ اپنے حاجت مند قریبی رشتہ داروں اور پبلک اداروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے مگر رشتہ داروں کا حق مقدم ہے۔ اس کے ساتھ ایسی وصیت ممنوع ٹھیرائی گئی ہے جس کا مقصود نابالغ اولاد یا غریب وارثوں کو حق وراثت سے محروم کرنا ہو۔ اس قانون کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اشتراکی "ترقی پسندوں" نے ۱۹۴۵ میں اُس قانون کی طرف رجعت فرمائی ہے جو ۲۵ ۲۶ میں بنایا گیا تھا۔

سود کی عقلی توجیہات سب سے پہلے جس بات کو طے ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ کیا فی الواقع سود ایک معقول چیز ہے ؟ کیا درحقیقت عقل کی رو سے ایک شخص اپنے دیئے ہوئے قرض پر سود کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے ؟ اور کیا انصاف یہی چاہتا ہے کہ جو شخص کسی سے قرض لے وہ اسکو اصل کے علاوہ کچھ نہ کچھ سود بھی دے ؟ یہ اس بحث کا اوّلین سوال ہے اور اس کے طے ہونے سے آدھی سے زیادہ بحث آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ اگر سود ایک معقول چیز ہے تو پھر تحریم سود کے مقدمے میں کوئی جان باقی نہیں رہتی ۔ اور اگر سود کو عقل و انصاف کی رو سے درست ثابت نہیں کیا جاسکتا تو پھر یہ امر غور طلب ہو جاتا ہے کہ انسانی معاشرے میں اس نامعقول چیز کو باقی رکھنے پر آخر کیوں اصرار کیا جائے ۔

توجیہ اوّل اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے جس دلیل سے ہم کو سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پس انداز کیا ہوا مال قرض دیتا ہے وہ خطرہ مول لیتا ہے ، ایثار کرتا ہے ، اپنی ضرورت روک کر دوسرے کی ضرورت پوری کرتا ہے ، جس مال سے وہ خود فائدہ اٹھا سکتا تھا اسے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے ۔ قرض لینے والے نے اگر قرض اس لئے لیا ہے کہ اپنی کوئی ذاتی ضرورت اس سے پوری کرے تو اسے اس مال کا کرایہ ادا کرنا چاہیئے جس طرح وہ مکان یا فرنیچر یا سواری کا کرایہ ادا کرتا ہے ۔ یہ کرایہ اُس خطرے کا معاوضہ بھی ہوگا جو دائن نے اپنا مال اس کے حوالہ کرنے میں برداشت کیا ، اور اس امر کا معاوضہ بھی ہوگا کہ دائن نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت خود استعمال کرنے کے بجائے اس کو استعمال کرنے کے لئے دے دی ۔ اور اگر مدیون نے یہ قرض کسی نفع آور کام میں لگانے کے لئے لیا ہے تو پھر تو دائن اس پر سود مانگنے کا بدرجۂ اولےٰ مستحق ہے ۔ جب مدیون اسکی دی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھا رہا ہے تو آخر دائن اس فائدے میں سے کیوں نہ حصّہ پائے ۔

اس توجیہ کا یہ حصّہ بالکل درست ہے کہ قرض دینے والا اپنا مال دوسرے کے حوالہ کرنے میں خطرہ بھی مول لیتا ہے اور ایثار بھی کرتا ہے ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا کہ وہ اس خطرے اور اس ایثار کی ایک قیمت ۵ ، یا ۱۰ فی صدی سالانہ یا ششماہی یا ماہوار کے حساب سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے ۔ خطرے کی بنیاد پر جو حقوق معقول طریقہ سے اسکو پہنچتے ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ وہ مدیون کی کوئی چیز رہن

رکھ لے، یا اسکی کسی چیز کی کفالت پر قرض دے، یا اس سے کوئی ضامن طلب کرے، یا پھر سرے سے خطرہ ہی مول نہ لے اور قرض دینے سے انکار کردے۔ مگر خطرہ نہ تو کوئی مالِ تجارت ہے جس کی کوئی قیمت ہو اور نہ وہ کوئی مکان یا فرنیچر یا سواری ہے کہ اس کا کوئی کرایہ ہو سکے۔ رہا ایثار تو وہ اُسی وقت تک ایثار ہے جب تک کہ وہ کاروبار نہ ہو۔ آدمی کو ایثار کرنا ہو تو پھر ایثار ہی کرے اور اس اخلاقی فعل کے اخلاقی فوائد پر راضی رہے۔ اور اگر وہ معاوضے کی بات کرتا ہے تو پھر ایثار کا ذکر نہ کرے بلکہ سیدھی طرح سوداگری کرے اور یہ بتائے کہ وہ قرض کے معاملہ میں اصل رقم کے علاوہ ایک مزید رقم ماہوار یا سالانہ کے حساب سے جو وصول کرتا ہے اس کا آخر وہ کس بنیاد پر مستحق ہے؟

کیا وہ ہرجانہ ہے؟ مگر جو رقم اس نے قرض دی ہے وہ اسکی ضرورت سے زائد تھی، اور اسے وہ خود استعمال بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس لئے یہاں فی الواقع کوئی "ہرج" واقع ہی نہیں ہوا کہ اپنے دیئے ہوئے اس قرض پر وہ کوئی "ہرجانہ" لینے کا مستحق ہو۔

کیا یہ کرایہ ہے؟ مگر کرایہ تو ان چیزوں کا ہوا کرتا ہے جنہیں کرایہ دار کے لئے مہیا کرنے اور درست رکھنے پر آدمی اپنا وقت، محنت اور مال صرف کرتا ہے اور جو کرایہ دار کے استعمال سے خراب ہوتی ہیں، ٹوٹتی پھوٹتی ہیں اور اپنی قیمت کھوتی رہتی ہیں۔ یہ تعریف اشیاءِ استعمال مثلاً مکان، فرنیچر اور سواری وغیرہ پر تو صادق آتی ہے، اور انہی کا کرایہ ایک معقول چیز ہے، لیکن اس تعریف کا اطلاق کسی طرح بھی اشیاءِ صرف (مثلاً گیہوں اور پھل) یا روپے پر نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کا کرایہ بالکل ایک بے معنی چیز ہے۔

زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ میں دوسرے شخص کو اپنے مال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے رہا ہوں لہٰذا مجھے اس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیئے۔ یہ البتہ ایک معقول بات ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جس فاقہ کش آدمی نے اپنے بھوکے بال بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے تم سے ۵ سیر گیہوں قرض لیئے ہیں، یا جس نے اپنے بیمار بچے یا بیوی یا ماں کا علاج کرانے کے لئے تم سے ۵۰ روپے عاریتہً حاصل کیئے ہیں، کیا واقعی وہ تمہارے دیئے ہوئے غلے یا روپے سے ایسا ہی "فائدہ" اٹھا رہا ہے جس میں سے تم ایک چھٹانک فی سیر یا ۲ روپے فی صد ماہوار کے حساب سے اپنا حصہ پانے کے مستحق ہو؟ فائدہ تو وہ بے شک اٹھا رہا ہے، اور اس استفادے کا موقع

بلاشبہ تم نے ہی اسے دیا ہے، لیکن عقل، انصاف، معاشی علم، کاروباری اصول، آخر کس چیز کی رو سے اس فائدے اور اس موقعِ استفادہ کی یہ نوعیت قرار پاتی ہے کہ تم اسکی ایک مالی قیمت مشخص کرو، اور قرض مانگنے والے کی مصیبت جتنی زیادہ سخت ہو اتنی ہی یہ قیمت بھی زیادہ ہو جائے، اور اسکی مصیبت زدگی کا زمانہ جتنا دراز ہوتا جائے تمہارے دیئے ہوئے اس موقع استفادہ" کی قیمت بھی مہینوں اور برسوں کے حساب سے اس پر بڑھتی اور چڑھتی چلی جائے؟ تم اگر اتنا بڑا دل نہیں رکھتے کہ ایک حاجت مند اور آفت رسیدہ انسان کو اپنی ضرورت سے زائد بچا ہوا مال عطا کر دو، تو حد سے حد جو بات تمہارے لئے معقول ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی رقم کی واپسی کا اطمینان کر کے اسے قرض دے دو۔ اور اگر تمہارے دل میں قرض دینے کی بھی گنجائش نہیں ہے تو بدرجۂ آخر یہ بھی ایک معقول بات ہو سکتی ہے کہ تم سرے سے اسکو کچھ نہ دو۔ مگر کاروبار اور تجارت کی یہ کونسی معقول صورت ہے کہ ایک شخص کی مصیبت اور تکلیف تمہارے لئے نفع اندوزی کا موقع ٹھہرے، بھوکے پیٹ اور جاں بلب مریض تمہارے لئے روپیہ لگانے کی جگہ قرار پائیں (Investment)، اور انسانی مصائب جتنے بڑھیں اتنے ہی تمہارے نفع کے امکانات بھی بڑھتے چلے جائیں!

" فائدہ اٹھانے کا موقع دینا" اگر کسی صورت میں کوئی مالی قیمت رکھتا ہے تو وہ صرف وہ صورت ہے جب کہ روپیہ لینے والا اسے کسی کاروبار میں لگا رہا ہو۔ اس صورت میں البتہ روپیہ دینے والا یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ مجھے اس فائدے میں سے حصہ ملنا چاہیئے جو میرے روپے سے دوسرا شخص اٹھا رہا ہے۔ لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا پس انداز کیا ہوا روپیہ کسی نفع آور کاروبار میں لگے اور کچھ فائدہ لائے اس کے لئے سیدھا اور معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ قرض دینے کے بجائے کسی کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور نفع و نقصان میں ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ دار بن جائے۔ نفع کمانے کا یہ آخر کونسا معقول طریقہ ہے کہ میں ایک شخص کا شریک بننے کے بجائے اسے سو روپے قرض دوں اور اس سے کہوں کہ چونکہ تو اس رقم سے فائدہ اٹھائے گا اس لئے تجھ پر میرا یہ حق ہے کہ مجھے مثلاً ایک روپیہ ماہوار اس وقت تک دیتا رہ جب تک میرے یہ روپے تیرے کاروبار میں استعمال ہو رہے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اگر وہ شخص کاروبار میں فائدے کے بجائے نقصان اٹھائے تو میں کس عقل و انصاف کی رو سے یہ ماہوار "منافع" اس سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں؟ اور اگر اس کا منافع ایک روپیہ ماہوار سے کم رہے

تو مجھے ایک روپیہ ماہوار لینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر اس کا کل منافع ایک ہی روپیہ ہو تو کونسا انصاف یہ جائز رکھتا ہے کہ جس شخص نے مہینہ بھر تک اپنا وقت، محنت، قابلیت اور ذاتی سرمایہ، سب کچھ صرف کیا وہ تو کچھ نہ پائے اور میں جو صرف سو روپے اسکو دے کر الگ ہو گیا تھا، اس کا سارا منافع لے اڑوں؟ ایک بیل بھی اگر تیلی کے لئے دن بھر کولہو چلاتا ہے تو کم از کم اس سے چارہ مانگنے کا حق تو ضرور رکھتا ہے۔ مگر یہ سودی قرض ایک کاروباری آدمی کو وہ بیل بنا دیتا ہے جسے کولہو تو دن بھر میرے لیئے چلانا چاہیئے اور چارہ کہیں اور سے کھانا چاہیئے!

پھر اگر بالفرض ایک کاروباری آدمی کا منافع اُس متعین رقم سے زائد بھی رہے جو قرض دینے والے نے سود کے طور پر اس کے ذمہ لگائی ہو، تب بھی عقل، انصاف، اصولِ تجارت، اور قانونِ معیشت، کسی چیز کی رو سے بھی اس بات کو معقول ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ تاجر، صناع، کاشتکار، اور دوسرے تمام وہ لوگ جو اصل عاملینِ پیدائش ہیں، جو سوسائٹی کی ضروریات تیار اور فراہم کرنے میں اپنے اوقات صرف کرتے ہیں، محنتیں برداشت کرتے ہیں، دماغ لڑاتے ہیں، اور اپنے جسم و ذہن کی ساری قوتیں کھپا دیتے ہیں، اُن سب کا فائدہ تو مشتبہ اور غیر معین ہو مگر صرف اُس ایک آدمی کا فائدہ یقینی اور معین ہو جس نے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم قرض دے دی ہے؟ اُن سب کے لئے تو نقصان کا خطرہ بھی ہو مگر اس کے لئے خالص نفع کی گارنٹی ہو؟ اُن سب کے نفع کی شرح بازار کی قیمتوں کے ساتھ گرتی اور چڑھتی رہے، مگر یہ ایک اللہ کا بندہ جو نفع اپنے لیئے طے کر چکا ہے وہ اسے جوں کا توں ماہ بماہ اور سال بسال ملتا رہے؟[1]

توجیہ دوم | اس تنقید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بادی النظر میں سود کو ایک معقول چیز قرار دینے کے لئے جو دلائل کافی سمجھ لیئے جاتے ہیں، ذرا گہرائی میں جاتے ہی ان کی کمزوری کھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اُس قرض کا تعلق ہے جو شخصی حاجات کے لیئے لیا جاتا ہے، اس پر سود عائد ہونے کے لئے تو سرے سے کوئی عقلی دلیل

[1] اس مقام پر ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ پھر تم زمین کے لگان کو کس طرح جائز ٹھہراتے ہو جب کہ اسکی پوزیشن بھی بعینہٖ سود کی سی ہے؟ مگر درحقیقت یہ اعتراض صرف اُن لوگوں پر وارد ہوتا ہے جو زمین کے نقد لگان، مثلاً ۲۰ روپیہ بیگھہ یا ۵ روپیہ ایکڑ کے حساب سے پیشگی معین کر لینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ میں اِس چیز کا قائل نہیں ہوں، بلکہ میں خود بھی اسے سود سے مشابہ سمجھتا ہوں، اس لیئے اس اعتراض کا جواب میرے ذمہ نہیں ہے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ مالکِ زمین اور کاشتکار کے درمیان معاملہ کی صحیح صورت صرف بٹائی ہے، یعنی یہ کہ جتنی پیداوار ہو گی اس کا اِتنا حصہ زمیندار کا اور اتنا کاشتکار کا۔ یہ معاملہ مضاربت کی تجارتی حصہ داری سے مشابہ ہے اور اسکو میں جائز سمجھتا ہوں۔

موجود ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ حامیانِ سود نے خود ہی اس کمزور مقدمے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ رہا وہ قرض جو کاروباری اغراض کے لئے دیا جاتا ہے، تو اس کے بارے میں بھی حامیانِ سود کو اس پیچیدہ سوال سے سابقہ پیش آتا ہے کہ سود آخر کس چیز کی قیمت ہے؟ ایک دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ مدیون کو وہ کونسی جوہری (Substantial) چیز دیتا ہے جس کی ایک مالی قیمت، اور وہ بھی ماہ بماہ و سال بسال ادا شدنی قیمت مانگنے کا اسے حق پہنچتا ہو؟

اس چیز کے تشخص کرنے میں حامیانِ سود کو خاصی پریشانی پیش آئی ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ وہ فائدہ اٹھانے کا "موقع" ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر کی تنقید سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے، یہ "موقع" کسی متعین اور یقینی اور بالفعل افزوں قیمت کا استحقاق پیدا نہیں کرتا، بلکہ صرف اس صورت میں ایک متناسب نفع کا استحقاق پیدا کرتا ہے جب کہ فی الواقع روپیہ لینے والے کو نفع ہو۔ دوسرا گروہ تھوڑی سی پوزیشن تبدیل کر کے کہتا ہے کہ وہ چیز "مہلت" ہے جو دائن اپنے سرمایہ کے ساتھ اس کے استعمال کے لئے مدیون کو دیتا ہے۔ یہ مہلت بجائے خود اپنی ایک قیمت رکھتی ہے اور جس قدر دراز ہوتی جائے اسکی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جس روز آدمی روپیہ لے کر کام میں لگاتا ہے، اُس روز سے لے کر اس دن تک جب کہ اس سرمایہ کے ذریعہ سے تیار کیا ہوا مال بازار میں پہنچے اور قیمت لائے، ایک ایک لمحہ کاروباری آدمی کے لئے قیمتی ہے۔ یہ مہلت اگر اسے نہ ملے اور بیچ ہی میں سرمایہ اس سے واپس لے لیا جائے تو سرے سے اس کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ وقت روپیہ لے کر لگانے والے کے لئے یقیناً ایک قیمت رکھتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے، پھر کیوں نہ روپیہ دینے والا اس فائدہ میں سے حصہ لے؟ اور اس وقت کی کمی و بیشی کے ساتھ مدیون کے لئے نفع کے امکانات بھی لامحالہ کم و بیش ہوتے ہیں، پھر کیوں نہ دائن وقت ہی کی درازی و کوتاہی کے لحاظ ہی سے اسکی قیمت مشخص کرے؟

مگر یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر روپیہ دینے والے کو کس ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص کام میں لگانے کے لئے اس سے روپیہ لے رہا ہے وہ ضرور نفع ہی حاصل کرے گا، نقصان سے دوچار نہ ہوگا؟ اور پھر یہ اس نے کیسے جانا کہ اس کو نفع بھی لازماً اس قدر ضرور ہی رہے گا لہٰذا ضرور اتنے فی صدی اُسکو روپیہ دینے والے کا حصہ ادا کرنا چاہیے اور پھر اس کے پاس یہ حساب لگانے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ وہ وقت جس کے دوران میں

وہ مدیون کو اپنے روپے کے استعمال کی مہلت دے رہا ہے لازماً ہر مہینے اور ہر سال اتنا نفع لاتا رہے گا لہٰذا ضرور اُس کی ماہوار و سالانہ قیمت یہ قرار پانی چاہیے ؟ اِن سوالات کا کوئی معقول جواب حامیانِ سود کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ کاروباری معاملات میں اگر کوئی چیز معقول ہے تو وہ صرف نفع و نقصان کی شرکت اور متناسب حصہ داری ہے نہ کہ سود جو ایک متعین شرح کے ساتھ عائد کر دیا جائے۔

توجیہ سوم | ایک اور گروہ کہتا ہے کہ نفع آوری سرمایہ کی ذاتی صفت ہے، لہٰذا ایک شخص کا دوسرے کے فراہم کردہ سرمایہ کو استعمال کرنا بجائے خود اس امر کا استحقاق پیدا کرتا ہے کہ دائن سود مانگے اور مدیون اسے ادا کرے۔ سرمایہ یہ قوت رکھتا ہے کہ اشیاء ضرورت کی تیاری و فراہمی میں مددگار ہو۔ سرمایہ کی مدد سے اتنا سامان تیار ہوتا ہے جتنا اسکی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ کی مدد شامل حال ہونے سے زیادہ مقدار میں زیادہ اچھا مال تیار ہوتا ہے اور اچھی قیمت دینے والی منڈیوں تک پہنچ سکتا ہے، ورنہ کم اور گھٹیا مال تیار ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر نہیں پہنچ سکتا جہاں زیادہ قیمت مل سکے۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ نفع آوری ایک ایسی صفت ہے جو سرمایہ کی ذات میں ودیعت کر دی گئی ہے، لہٰذا مجرد اس کا استعمال ہی سود کا استحقاق پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اول تو یہ دعویٰ ہی بداہتہً غلط ہے کہ سرمایہ میں "نفع آوری" نام کی کوئی ذاتی صفت پائی جاتی ہے۔ یہ صفت تو اس میں صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آدمی اسے لے کر کسی مثمر کام میں لگائے۔ صرف اسی صورت میں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ روپیہ لینے والا چونکہ اس سے ایک نافع کام لے رہا ہے اس لئے اسے نفع میں سے حصہ دینا چاہیے۔ مگر جو شخص بیماری میں علاج پر صرف کرنے کے لئے، یا کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لئے روپیہ قرض لے رہا ہے اُس کے پاس یہ سرمایہ آخر کونسی معاشی قدر پیدا کرتا ہے جس میں حصہ بٹانے کا حق دائن کو پہنچتا ہو؟

پھر جو سرمایہ نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے وہ بھی لازماً زیادہ قیمت ہی پیدا نہیں کرتا کہ یہ دعوےٰ کیا جا سکے کہ نفع بخشی اسکی ذاتی صفت ہے۔ بسا اوقات کسی کام میں زیادہ سرمایہ لگا دینے سے نفع بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتا ہے، یہاں تک کہ الٹے نقصان کی نوبت آجاتی ہے۔ آج کل تجارتی دنیا پر تھوڑی تھوڑی مدت بعد جو بحرانی دورے پڑتے رہتے ہیں اُن کی وجہ یہی تو ہے کہ جب سرمایہ دار کاروبار میں بے تحاشا سرمایہ لگاتے چلے جاتے ہیں اور پیداوار بڑھنی شروع ہوتی ہے تو قیمتیں گرنے لگتی ہیں اور افزونیِ مال کے ساتھ ارزانیِ قدر

رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ سرمایہ لگانے سے کسی نفع کی توقع باقی نہیں رہتی۔

مزید برآں سرمایہ میں نفع آوری کی اگر کوئی صفت ہے بھی تو اُس کا قوت سے فعل میں آنا بہت سی دوسری چیزوں پر منحصر ہے۔ مثلاً اس کے استعمال کرنے والوں کی محنت، قابلیت، ذہانت اور تجربہ کاری۔ دورانِ استعمال میں معاشی، تمدنی اور سیاسی حالات کی سازگاری۔ آفاتِ زمانہ سے محفوظیت۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے امور نفع بخشی کے لازمی شرائط ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو بسا اوقات سرمایہ کی ساری نفع بخشی ختم ہو جاتی ہے، بلکہ الٹی نقصان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر سودی کاروبار میں سرمایہ دینے والا نہ تو خود ان شرطوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، اور نہ یہی مانتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی شرط کے مفقود ہو جانے سے اس کا سرمایہ نفع آور نہ ہو سکا تو وہ کوئی سود لینے کا حق دار نہ ہوگا۔ وہ تو اس بات کا مدعی ہے کہ اس کے سرمایہ کا استعمال بجائے خود سود کا استحقاق پیدا کرتا ہے خواہ فی الواقع کوئی "نفع آوری" اس سے ظہور میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔

بدرجۂ آخر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سرمایہ کی ذات ہی میں نفع بخشی موجود ہے جس کی بنا پر سرمایہ دینے والا نفع میں سے حصہ پانے کا مستحق ہے، تب بھی آخر وہ کونسا حساب ہے جس سے تعین کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ آج کل سرمایہ کی نفع بخشی لازماً اس قدر ہے لہٰذا جو لوگ سرمایہ لے کر استعمال کریں اُن کو لازماً اس شرح سے سود ادا کرنا چاہیئے؟ اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ زمانۂ حال کے لئے اس شرح کا تعین کسی حساب سے ممکن ہے تو ہم یہ سمجھنے سے تو بالکل ہی قاصر ہیں کہ جو سرمایہ دار ۱۹۴۹ء میں کسی کاروباری ادارے کو ۱۰ سال کے لئے، اور کسی دوسرے ادارے کو ۲۰ سال کے لئے رائج الوقت شرحِ سود پر قرض دے رہا ہے اس کے پاس یہ معلوم کرنے کا آخر کیا ذریعہ ہے کہ آئندہ دس اور بیس سال کے دوران میں سرمایہ کی نفع بخشی ضرور آج ہی کے معیار پر قائم رہے گی؟ خصوصاً جب کہ ۱۹۵۹ء میں بازار کی شرح سود ۱۹۴۹ء سے بالکل مختلف ہو اور ۱۹۶۹ء میں اس سے بھی زیادہ مختلف ہو جائے تب کس دلیل سے اُس شخص کو حق بجانب ٹھہرایا جائیگا جس نے ایک ادارے سے دس سال کے لئے اور دوسرے ادارے سے بیس سال کے لئے ۱۹۴۹ء کی شرح کے مطابق سرمایہ کے متوقع منافع میں سے اپنا حصہ قطعی طور پر متعین کرا لیا تھا؟

توجیہ چہارم | آخری توجیہ میں ذرا زیادہ ذہانت صرف کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

انسان فطرۃً حاضر فائدے کے، لطف، لذت اور آسودگی کو دور دراز مستقبل کے فوائد ولذائذ پر ترجیح دیتا ہے: مستقبل جتنا دور ہو اسی قدر اس کے فوائد ولذائذ مشتبہ ہوتے ہیں اور اسی مناسبت سے آدمی کی نگاہ میں ان کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس ترجیحِ عاجلہ اور مرجوحیتِ آجلہ کے متعدد وجوہ ہیں، مثلاً:-

۱۔ مستقبل کا تاریکی میں ہونا اور زندگی کا غیر یقینی ہونا جس کی وجہ سے مستقبل کے فوائد مشتبہ بھی ہوتے ہیں اور اُن کی کوئی واضح تصویر بھی آدمی کی چشم تصور میں نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے آج جو نقد فائدہ حاصل ہو رہا ہے وہ یقینی بھی ہے اور اسکو آدمی بچشم سر بھی دیکھ رہا ہے۔

۲۔ جو شخص اس وقت حاجت مند ہے اُسکی حاجت کا اس وقت پورا ہو جانا اُس کے لئے اس سے بہت زیادہ قیمت رکھتا ہے کہ آئندہ کسی موقع پر اُسکو وہ چیز ملے جس کا ممکن ہے کہ وہ اُس وقت حاجت مند ہو اور ممکن ہے کہ نہ ہو۔

۳۔ جو مال اس وقت مل رہا ہے وہ بالفعل کارآمد اور قابل استعمال ہے، اس لحاظ سے وہ اُس مال پر فوقیت رکھتا ہے جو آئندہ کسی وقت حاصل ہوگا۔

اِن وجوہ سے حاضر کا نقد فائدہ مستقبل کے مشتبہ فائدے پر ترجیح رکھتا ہے۔ لہٰذا آج جو شخص ایک رقم قرض لے رہا ہے اسکی قیمت لازماً اُس رقم سے زیادہ ہے جو وہ کل دائن کو ادا کرے گا، اور سود وہ قدر زائد ہے جو ادائیگی کے وقت اصل کے ساتھ شامل ہو کر اسکی قیمت کو اُس رقم کے برابر کرتی ہے جو قرض دیتے وقت دائن نے اسکو دی تھی۔ مثال کے طور پر اس معاملہ کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص ساہوکار کے پاس آتا ہے اور اس سے سو روپے قرض مانگتا ہے۔ ساہوکار اس سے یہ بات طے کرتا ہے کہ آج جو سو روپے وہ اسکو دے رہا ہے ان کے بدلے میں وہ ایک سال بعد اس سے ۱۰۳ روپے لیگا۔ اس معاملہ میں دراصل حاضر کے ۱۰۰ روپوں کا تبادلہ مستقبل کے ۱۰۳ روپوں سے ہو رہا ہے۔ تین روپے اُس فرق کے برابر ہیں جو حاضر کے مال اور مستقبل کے مال کی نفسیاتی (نہ کہ معاشی) قیمت کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ تین روپے ایک سال بعد کے سو روپوں کے ساتھ شامل نہ ہوں گے ان کی قیمت اُن سو روپوں کے برابر نہ ہوگی جو قرض دیتے وقت دائن نے مدیون کو دیئے تھے۔

یہ توجیہ جس ہوشیاری کے ساتھ کی گئی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ مگر درحقیقت اس میں حاضر اور مستقبل کی نفسیاتی قیمت کا جو فرق بیان کیا گیا ہے وہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

کیا فی الواقع انسانی فطرت حاضر کو مستقبل کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور زیادہ قیمتی سمجھتی ہے؟ اگر یہ بات ہے تو کیا وجہ ہے کہ بیشتر لوگ اپنی ساری کمائی کو آج ہی خرچ کر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ایک حصے کو مستقبل کے لئے بچا رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟ شاید آپ کو ایک فی صدی بھی ایسے آدمی نہ ملیں گے جو فکر فردا سے بے نیاز ہوں اور آج کے لطف و لذت پر اپنا سارا مال اڑا دینے کو ترجیح دیتے ہوں۔ کم از کم ۹۹ فی صدی انسانوں کا حال تو یہی ہے کہ وہ آج کی ضرورتوں کو روک کر کل کے لئے کچھ نہ کچھ سامان کر رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ مستقبل میں پیش آنے والی بہت سی متوقع اور ممکن ضرورتیں اور اندیشناک صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیالی نقشہ آدمی کی نگاہ میں اُن حالات کی بہ نسبت زیادہ بڑا اور اہم ہوتا ہے جن سے وہ اس وقت کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم گزرے جا رہا ہے پھر وہ ساری دوڑ دھوپ اور تگ و دو جو ایک انسان زمانۂ حال میں کرتا ہے اُس سے مقصود آخر اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل بہتر ہو؟ اپنی آج کی محنتوں کے سارے ثمرات آدمی اسی کوشش میں تو کھپاتا ہے کہ اس کے آنے والے ایام زندگی آج سے زیادہ اچھی طرح بسر ہوں۔ کوئی احمق سے احمق آدمی بھی بمشکل آپ کو ایسا مل سکیگا جو اس قیمت پر اپنے حاضر کو خوش آیند بنانا پسند کرتا ہو کہ اس کا مستقبل خراب ہو جائے یا کم از کم آج سے زیادہ بدتر ہو۔ جہالت و نادانی کی بنا پر آدمی ایسا کر جائے، یا کسی وقتی خواہش کے طوفان سے مغلوب ہو کر ایسا کر گذرے تو بات دوسری ہے، ورنہ سوچ سمجھ کر تو کوئی شخص بھی اس رویّے کو صحیح و معقول قرار نہیں دیتا۔

پھر اگر تھوڑی دیر کے لئے اس دعوے کو جوں کا توں مان بھی لیا جائے کہ انسان حاضر کے اطمینان کی خاطر مستقبل کے نقصان کو گوارا کرنا درست سمجھتا ہے، تب بھی وہ استدلال ٹھیک نہیں بیٹھتا جس کی بنا اس دعوے پر رکھی گئی ہے۔ قرض لیتے وقت جو معاملہ دائن اور مدیون کے درمیان طے ہوا تھا اُس میں تو آپ کے قول کے مطابق حاضر کے ۱۰۰ روپوں کی قیمت ایک سال بعد کے ۱۰۳ روپوں کے برابر تھی۔ لیکن اب جو ایک سال کے بعد مدیون اپنا قرض ادا کرنے گیا تو واقعی صورتِ معاملہ کیا ٹھیری؟ یہ کہ حاضر کے ۱۰۳ روپے ماضی کے سو روپوں

کے برابر ہو گئے - اور اگر پہلے سال مدیون قرض ادا نہ کر سکا تو دوسرے سال کے خاتمے پر ماضی بعید کے سو روپیں کی قیمت حاضر کے ۲۰۰ روپوں کے برابر ہو گئی - کیا فی الواقع ماضی اور حال میں قدر و قیمت کا یہی تناسب ہے؟ اور کیا یہ اصول بھی صحیح ہے کہ جتنا جتنا ماضی پرانا ہوتا جائے اسکی قیمت بھی حال کے مقابلے میں بڑھتی چلی جائے؟ کیا پہلے گزری ہوئی ضرورتوں کی آسودگی آپ کے لئے اتنی ہی قابلِ قدر ہے کہ جو روپے آپ کو ایک مدتِ دراز پہلے ملے تھے اور جن کو خرچ کر کے آپ کبھی کا نسیاً منسیا کر چکے ہیں، وہ آپ کے لئے زمانے کی ہر ساعت گزرنے پر حاضر کے روپوں سے زیادہ قیمتی ہوتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اگر آپ کو سو روپے استعمال کئے ہوئے پچاس برس گزر چکے ہوں تو اب ان کی قیمت ڈھائی سو روپے کے برابر ہو جائے؟

شرح سود کی معقولیت؟ یہ ہے اُن دلائل کی کل کائنات جو سود خواری کے وکیل اسکو عقل و انصاف کی رو سے ایک جائز و مناسب چیز ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں - تنقید سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ معقولیت سے اس ناپاک چیز کو دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے کسی وزنی دلیل سے بھی اس بات کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جاسکتی کہ سود کیوں لیا اور دیا جائے - لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اس قدر غیر معقول تھی، مغرب کے علما اور مفکرین نے اسکو بالکل بدیہیات و مسلّمات میں شامل کر لیا، اور نفسِ سود کی معقولیت کو گویا ایک طے شدہ صداقت اور مانی ہوئی حقیقت فرض کر کے ساری گفتگو اس امر پر مرکوز کر دی کہ شرحِ سود معقول ہونی چاہیئے - دورِ جدید کے مغربی لٹریچر میں یہ بحث تو آپ کو کم ہی کہیں ملے گی کہ سود بجائے خود لینے اور دینے کے لائق چیز ہے بھی یا نہیں، البتہ جو کچھ بھی رد و قدح آپ ان کے ہاں دیکھیں گے وہ زیادہ تر اس امر سے متعلق ہو گی کہ فلاں شرحِ سود "بیجا" اور حدّ سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے قابلِ اعتراض ہے، اور فلاں شرح "معقول" ہے اس لئے قابلِ قبول ہے۔

مگر کیا فی الواقع کوئی شرحِ سود معقول بھی ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے ہم اس سوال کو نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ جس چیز کا بجائے خود معقول ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا اُس کی شرح کے معقول یا نامعقول ہونے کی بحث پیدا ہی کہاں ہوتی ہے - اس سوال سے قطعِ نظر کر کے ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کونسی شرحِ سود ہے جس کو فطری اور معقول کہا جاتا ہے؟ اور ایک شرح کے بجا یا بیجا ہونے کا آخر معیار کیا ہے؟ اور کیا درحقیقت دنیا کے سودی کاروبار میں شرحِ سود کا تعین کسی عقلی (Rational) بنیاد پر ہو رہا ہے؟

اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو اولین حقیقت جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ معقول شرحِ سود نامی کوئی چیز دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی ہے۔ مختلف شرحوں کو مختلف زمانوں میں معقول ٹھہرایا گیا ہے اور بعد میں وہی شرحیں نامعقول قرار دے دی گئی ہیں۔ بلکہ ایک ہی زمانہ میں ایک جگہ معقول شرح کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ اور۔ قدیم ہندو دور میں کوتلیہ (Kautilya) کی تصریح کے مطابق ۶۰ فی صدی سالانہ تک شرح سود بالکل معقول اور جائز سمجھی جاتی تھی، اور اگر خطرہ زیادہ ہو تو اس سے بھی زیادہ شرح ہو سکتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسطِ آخر اور انیسویں صدی کے وسطِ اول میں ہندوستانی ریاستوں کے جو مالی معاملات ایک طرف دیسی ساہوکاروں سے اور دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے ہوتے تھے اُن میں بالعموم ۴۸ فی صدی سالانہ شرح رائج تھی۔ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگِ عظیم کے زمانے میں حکومتِ ہند نے ۶½ فی صدی سالانہ سود پر جنگی قرضے حاصل کیے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان کوآپریٹو سوسائیٹیوں میں عام شرح سود ۱۲ سے ۱۵ فی صدی تک رہی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے دور میں ملک کی عدالتیں ۹ فی صدی سالانہ کے قریب شرح کو معقول قرار دیتی رہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے لگ بھگ زمانے میں ریزرو بینک آف انڈیا کا ڈسکونٹ ریٹ ۳ فی صدی سالانہ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ میں بھی قائم رہی بلکہ پونے تین فی صدی پر بھی حکومتِ ہند کو قرضے ملتے رہے۔ یہ تو ہے خود ہمارے اپنے برعظیم کا حال۔ اُدھر یورپ کو دیکھئے تو وہاں بھی آپ کو کچھ ایسا ہی نقشہ نظر آئے گا۔ سولھویں صدی کے وسط میں انگلستان میں ۱۰ فی صدی شرح بالکل معقول قرار دی گئی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے قریب زمانے میں یورپ کے بعض سنٹرل بینک آٹھ نو فی صدی شرح لگاتے تھے اور خود مجلس اقوام نے یورپ کی ریاستوں کو اپنی وساطت سے جو قرضے اُس دور میں دلوائے تھے ان کی شرح بھی اسی کے لگ بھگ تھی۔ مگر آج یورپ اور امریکہ میں کسی کے سامنے اس شرح کا نام لیجئے تو وہ چیخ اُٹھے گا کہ یہ شرح سود نہیں بلکہ لوٹ ہے۔ اب جدھر دیکھئے ۲½ اور ۳ فی صدی شرح کا چرچا ہے۔ ۴ فی صدی انتہائی شرح ہے، اور بعض حالات میں ایک اور ½ اور ¾ فی صدی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف غریب عوام کو سودی قرض دینے والے مہاجنوں کے لئے انگلستان میں ۱۹۲۷ء کے منی لینڈرس ایکٹ کی رو سے جو شرح جائز رکھی گئی ہے وہ ۴۸ فی صدی سالانہ ہے اور امریکہ کی عدالتیں سُود خوار مہاجنوں کو جس شرح کے مطابق سود دلوا رہی ہیں وہ ۳۰ سے شروع ہو کر ۶۰ فی صدی سالانہ تک پہنچ جاتی ہے۔

بتائیے ان میں سے کس کا نام فطری اور معقول شرح سود ہے؟

اب ذرا آگے بڑھ کر اس مسئلے کا جائزہ لیجئے کہ کیا فی الحقیقت کوئی شرح سود فطری اور معقول ہو بھی سکتی ہے؟ اس سوال پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کی عقل خود بتا دے گی کہ شرحِ سود اگر معقول طور پر متعین ہو سکتی تھی تو صرف اس صورت میں جب کہ اُس فائدے کی قیمت مشخص ہوتی یا ہو سکتی، جو ایک شخص کسی قرض لی ہوئی رقم سے اٹھاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ بات متعین ہو جاتی کہ ایک سال تک سو روپے کا استعمال ۲۵ روپے کے برابر فائدہ دیتا ہے تو البتہ یہ طے کیا جا سکتا تھا کہ اس فائدے میں سے ۵ یا ۲½ یا ۱½ روپیہ اُس شخص کا فطری اور معقول حصہ ہے جس کی رقم دورانِ سال میں استعمال کی گئی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس طرح سے استعمالِ سرمایہ کا فائدہ نہ تو مشخص کیا گیا ہے، نہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ بازاری شرح سود کے تعین میں کبھی اس امر کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ روپیہ قرض لینے والے کو اس سے کتنا فائدہ ہوگا، بلکہ کوئی فائدہ ہوگا بھی یا نہیں۔ عملاً جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حاجتی کاروبار میں تو قرض کی قیمت قرض مانگنے والے کی مجبوری کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے، اور تجارتی سودخواری کی منڈی میں شرح سود کا اتار چڑھاؤ کچھ دوسری بنیادوں پر ہوتا رہتا ہے جن کو عقل اور انصاف سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

شرح سود کے وجوہ پہلی قسم کے کاروبار میں ایک مہاجن یہ دیکھتا ہے کہ جو شخص اس سے قرض مانگنے آیا ہے وہ کس حد تک غریب ہے، کتنا مجبور ہے اور قرض نہ ملنے کی صورت میں کس قدر زیادہ مبتلائے آفت ہوگا۔ انہی چیزوں کے لحاظ سے وہ طے کرتا ہے کہ مجھے اس سے کتنا سود مانگنا چاہیے۔ اگر وہ کم غریب ہے، کم رقم مانگ رہا ہے اور بہت زیادہ پریشان نہیں ہے تو شرح سود کم ہوگی۔ اس کے برعکس وہ جتنا زیادہ خستہ حال اور جس قدر زیادہ سخت حاجتمند ہوگا اتنی ہی شرح بڑھتی چلی جائیگی، حتیٰ کہ اگر کسی فاقہ کش آدمی کا بچہ بیماری کی حالت میں دم توڑ رہا ہو تو چار پانچ سو فی صدی شرح سود بھی اس کے معاملہ میں کچھ "بے جا" نہیں ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں "فطری" شرح سود قریب قریب اُسی معیار کے لحاظ سے مشخص ہوتی ہے جس معیار کے لحاظ سے ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ قیامت میں امرتسر کے اسٹیشن پر ایک سکھ نے ایک مسلمان سے پانی کے ایک گلاس کی "فطری" قیمت ۲۰۰ روپے وصول کی تھی، کیونکہ اس کا بچہ پیاس سے مر رہا تھا اور پناہ گزینوں کی ٹرین سے کوئی مسلمان نیچے اتر کر خود پانی نہیں لے سکتا تھا!

رہا دوسری قسم کا بازارِ مالیات، تو اس میں شرح سود کا تعین اور اس کا اتار چڑھاؤ جن بنیادوں پر ہوتا ہے ان کے بارے میں ماہرین معاشیات کے دو مسلک ہیں:

(۱) ایک گروہ کہتا ہے کہ طلب اور رسد کا قانون اسکی بنیاد ہے۔ جب روپیہ لگانے کے خواہشمند کم ہوتے ہیں اور قرض دینے کے قابل رقمیں زیادہ ہوجاتی ہیں تو سُود کی شرح گرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جب بہت زیادہ گر جاتی ہے تو لوگ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کاروبار میں لگانے کیلئے روپیہ قرض لینے پر بکثرت آمادہ ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب روپے کی مانگ بڑھنی شروع ہوتی ہے اور قابلِ قرض رقمیں کم ہونے لگتی ہیں تو شرح سود بڑھنی شروع ہوجاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ قرض کی مانگ رک جاتی ہے۔

غور کیجئے، اس کے معنی کیا ہیں۔ سرمایہ دار یہ نہیں کرتا کہ سیدھا اور معقول طریقہ سے کاروباری آدمی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرے اور انصاف کے ساتھ اُسکے واقعی منافع میں اپنا حصہ لگائے۔ اس کے بجائے وہ ایک اندازہ کرتا ہے کہ کاروبار میں اس شخص کو کم از کم اتنا فائدہ ہوگا لہٰذا جو رقم میں اسے دے رہا ہوں اس پر مجھے اتنا سُود ملنا چاہیئے دوسری طرف کاروباری آدمی بھی اندازہ کرتا ہے کہ جو روپیہ میں اس سے لیکر لگا رہا ہوں وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا نفع دے سکتا ہے لہٰذا سود اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ دونوں قیاس (Speculation) سے کام لیتے ہیں۔ سرمایہ دار ہمیشہ کاروبار کے منافع کا مبالغہ آمیز تخمینہ کرتا ہے۔ اور کاروباری آدمی نفع کی امیدوں کے ساتھ نقصان کے اندیشوں کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ اس بنا پر دونوں کے درمیان تعاون کے بجائے ایک دائمی کشمکش برپا رہتی ہے۔ جب کاروباری آدمی نفع کی امید پر سرمایہ لگانا چاہتا ہے تو سرمایہ دار اپنے سرمایہ کی قیمت بڑھانی شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ اتنی بڑھ جاتا ہے کہ اس قدر شرح سود پر روپیہ لے کر کام میں لگانا کسی طرح نفع بخش نہیں رہتا۔ اس طرح آخر کار روپے کا کام میں لگنا بند ہوجاتا ہے اور معاشی ترقی کی رفتار یکایک رک جاتی ہے۔ پھر جب کساد بازاری کا سخت دورہ پوری کاروباری دنیا پر پڑ جاتا ہے اور سرمایہ دار دیکھتا ہے کہ اسکی اپنی تباہی قریب آ گئی ہے تو وہ شرح سود کو اس حد تک گرا دیتا ہے کہ کاروباری آدمیوں کو اس شرح پر روپیہ لیکر لگانے میں نفع کی امید ہو جاتی ہے اور صنعت و تجارت کے بازار میں پھر سرمایہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر معقول شرائط پر سرمائے اور کاروبار کے درمیان حصہ دارانہ تعاون ہوتا تو ایک ہموار طریقے سے دنیا کی معیشت کا نظام

چل سکتا تھا لیکن جب قانون نے سرمایہ دار کے لئے سود پر روپیہ چلانے کا راستہ کھول دیا تو سرمائے اور کاروبار کے باہمی تعلقات میں سٹہ بازی اور جواری پن کی روح داخل ہوگئی اور شرح سود کی کمی وبیشی ایسے قمار بازانہ طریقوں پر ہونے لگی جن کی بدولت پوری دنیا کی معاشی زندگی ایک دائمی بحران میں مبتلا رہتی ہے۔

(۲) دوسرا گروہ شرح سود کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ جب سرمایہ دار روپے کو خود اپنے لئے قابل استعمال رکھنا زیادہ پسند کرتا ہے تو وہ سود کی شرح بڑھا دیتا ہے، اور جب اسکی یہ خواہش کم ہو جاتی ہے تو سود کی شرح بھی گھٹ جاتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ سرمایہ دار نقد روپیہ اپنے پاس رکھنے کو کیوں ترجیح دیتا ہے؟ تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ کچھ نہ کچھ روپیہ اپنی ذاتی یا کاروباری ضرورتوں کیلئے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ ناگہانی حالات اور غیر متوقع ضروریات کے لئے بھی محفوظ رکھنا پڑتا ہے، مثلاً کسی ذاتی معاملہ میں کوئی غیر معمولی خرچ یا کسی اچھے سودے کا موقعہ یکایک سامنے آجانا۔ ان دو وجوہ کے علاوہ تیسری وجہ، اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار یہ پسند کرتا ہے کہ مستقبل میں کسی وقت قیمتیں گرنے یا شرح سود چڑھنے کی صورت میں فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے پاس نقد روپیہ کافی موجود ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر روپے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی جو خواہش سرمایہ دار کے دل میں پیدا ہوتی ہے، کیا وہ گھٹتی بڑھتی ہے کہ اس کا اثر شرح سود کے اتار چڑھاؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے؟ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ہاں مختلف شخصی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی اسباب سے کبھی یہ خواہش بڑھ جاتی ہے اسلئے سرمایہ دار شرح سود بڑھا دیتا ہے اور کاروبار کی طرف سرمایہ آنا کم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس خواہش میں کمی آجاتی ہے اسلئے سرمایہ دار شرح سود گھٹا دیتا ہے اور اس کے گھٹنے کی وجہ سے لوگ تجارت وصنعت میں لگانے کیلئے زیادہ سرمایہ قرض لینے لگتے ہیں۔

اس خوشنما توجیہ کے پیچھے ذرا جھانک کر دیکھئے کہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔ جہاں تک خانگی ضروریات، یا ذاتی کاروبار کی ضروریات کا تعلق ہے ان کی بنا پر معمولی اور غیر معمولی سب طرح کے حالات میں سرمایہ دار کی یہ خواہش کہ وہ سرمایہ کو اپنے لئے قابل استعمال رکھے بمشکل اسکے پانچ فیصدی سرمائے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلئے پہلی دونوں وجہوں کو خواہ مخواہ اہمیت دینا صحیح نہیں ہے۔ اپنا ۹۵ فیصدی سرمایہ جس بنیاد پر وہ کبھی روکتا ہے اور کبھی بازار قرض کی طرف بہاتا ہے، وہ تو تیسری وجہ ہے اور اس کا تجزیہ کیجئے تو اس کے اندر سے اصل حقیقت یہ برآمد ہوگی کہ سرمایہ دار

کمال درجہ کی خود غرضانہ نیت کے ساتھ دنیا کے اور خود اپنے ملک و قوم کے حالات کو دیکھتا رہتا ہے۔ اِن حالات میں کبھی وہ کچھ مخصوص آثار دیکھتا ہے اور انکی بنا پر چاہتا ہے کہ اس کے پاس وہ ہتھیار ہر وقت موجود رہے جس کے ذریعہ سے وہ سوسائٹی کی مشکلات آفات اور مصائب کا ناجائز فائدہ اٹھا سکے اور اسکی پریشانیوں میں اضافہ کر کے اپنی خوشحالی بڑھا سکے! اسلئے وہ سٹہ بازی کی خاطر سرمایہ کو اپنے لئے روک لیتا ہے، شرح سود بڑھا دیتا ہے، تجارت و صنعت کی طرف سرمائے کا بہاؤ یکلخت بند کر دیتا ہے اور سوسائٹی پر اس بلائے عظیم کا دروازہ کھول دیتا ہے جس کا نام "کساد بازاری" ہے پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ اس راستہ سے جو کچھ حرام خوری وہ کر سکتا تھا کر چکا، آگے مزید فائدے کا کوئی امکان باقی نہیں ہے، بلکہ نقصان کی سرحد قریب آ لگی ہے تو سرمائے کو اپنے لئے قابل استعمال رکھنے کی خواہش اُس کے نفسِ خبیث میں کم ہو جاتی ہے اور وہ کم شرحِ سود کا لالچ دے کر کاروباری لوگوں کو صلائے عام دینے لگتا ہے کہ آؤ میرے پاس بہت سا روپیہ تمہارے لئے قابل استعمال پڑا ہے۔

شرح سود کی بس یہی دو توجیہات موجودہ زمانے کے ماہرین معاشیات نے کی ہیں، اور اپنی اپنی جگہ دونوں ہی صحیح ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان میں سے جو وجہ بھی ہو، اس سے آخر ایک "معقول" اور "فطری" شرح کس طرح متعین ہوتی یا ہو سکتی ہے؟ یا تو ہمیں عقل اور معقولیت اور فطرت کے مفہومات بدلنے پڑیں گے، یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ سود خود جس قدر نامعقول چیز ہے اسکی شرح بھی اتنے ہی نامعقول اسباب سے متعین ہوتی اور گھٹتی بڑھتی ہے۔

سود کا معاشی فائدہ اور اسکی ضرورت؟ اس کے بعد سود کے وکلاء یہ بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ سود ایک معاشی ضرورت ہے اور کچھ فوائد ایسے ہیں جو اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس دعوے کی تائید میں جو دلائل وہ دیتے ہیں انکا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انسانی معیشت کا سارا کاروبار سرمائے کے اجتماع پر منحصر ہے، اور سرمائے کا جمع ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ لوگ اپنی ضروریات اور خواہشات پر پابندی عائد کریں اور اپنی ساری ساری آمدنیوں کو اپنی ذات پر خرچ نہ کر ڈالیں بلکہ کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرتے رہا کریں۔ یہی ایک صورت ہے سرمایہ اکٹھا ہونے کی۔ لیکن آخر ایک آدمی کیوں اپنی ضروریات کو روکنے اور کفایت شعاری کرنے پر آمادہ ہو اگر اسے اس ضبطِ نفس اور اس قربانی کا کوئی اجر نہ ملے؟ سود ہی تو وہ اجر ہے جس کی امید لوگوں کو روپیہ بچانے پر آمادہ کرتی ہے۔ تم اسے حرام کر دو گے تو سرے سے فاضل آمدنیوں کو محفوظ کرنے کا سلسلہ ہی بند ہو جائے گا جو سرمایہ کی بہم رسانی کا اصل ذریعہ ہے۔

(۲) معاشی کاروبار کی طرف سرمائے کے بہاؤ کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ لوگوں کیلئے اپنی جمع شدہ دولت کو سود پر چلانے کا دروازہ کھلا رہے۔ اس طرح سود ہی کا لالچ ان سے روپیہ جمع کراتا ہے پھر سود ہی کا لالچ ان کو اس بات پر بھی آمادہ کرتا رہتا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقموں کو بیکار نہ ڈال رکھیں بلکہ کاروباری لوگوں کے حوالہ کردیں اور ایک مقرر شرح کے مطابق سود وصول کرتے رہیں۔ اس دروازے کو بند کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نہ صرف روپیہ جمع کرنے کا ایک اہم ترین محرک غائب ہو جائے، بلکہ جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع ہو وہ بھی کاروبار میں لگنے کے لئے حاصل نہ ہوسکے۔

(۳) سود صرف یہی نہیں کرتا کہ سرمایہ جمع کراتا اور اسے کاروبار کی طرف کھینچ کر لاتا ہے، بلکہ وہی اُس کے غیر مفید استعمال کو روکتا بھی ہے۔ اور شرح سود وہ چیز ہے جو بہترین طریقہ سے آپ ہی آپ اس امر کا انتظام کرتی رہتی ہے کہ سرمایہ کاروبار کی مختلف ممکن تجویزوں میں سے اُن تجویزوں کی طرف جائے۔ جو اُن میں سب سے زیادہ بارآور ہوں۔ اس کے سوا کوئی تدبیر ایسی سمجھ میں نہیں آتی جو مختلف عملی تجویزوں میں سے نافع کو غیر نافع سے اور زیادہ نافع کو کم نافع سے ممیز کرے اور انفع کی طرف سرمائے کا رخ پھیرتی رہے۔ تم سود کو اُڑا دوگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اوّل تو لوگ بڑی بے پروائی سے سرمایہ استعمال کرنے لگیں گے، اور پھر بلالحاظ نفع ونقصان، ہر طرح کے الٹے سیدھے کاموں میں اسے لگانا شروع کردینگے۔

(۴) قرض وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کی ناگزیر ضروریات میں سے ہے۔ افراد کو بھی اپنے ذاتی معاملات میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کاروباری لوگوں کو بھی آئے دن اسکی حاجت رہتی ہے، اور حکومتوں کا کام بھی اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس کثرت سے اتنے بڑے پیمانے پر قرض کی بہم رسانی آخر نری خیرات کے بل پر کہاں تک ہوسکتی ہے۔ اگر تم صاحب سرمایہ لوگوں کو سود کا لالچ نہ دوگے اور اس امر کا اطمینان بہم نہ پہنچاؤ گے کہ ان کے راس المال کے ساتھ ان کا سود بھی ان کو ملتا رہیگا تو وہ بمشکل ہی قرض دینے پر آمادہ ہوں گے اور اس طرح قرضوں کی بہم رسانی رک جانے کا نہایت برا اثر پوری معاشی زندگی پر مترتب ہوگا۔ ایک غریب آدمی کو اپنے برے وقت پر مہاجن سے قرض مل تو جاتا ہے۔ سود کا لالچ نہ ہو تو اُس کا مردہ بے کفن ہی پڑا رہ جائے اور کوئی اسکی طرف مدد کا ہاتھ نہ بڑھائے۔ ایک تاجر کو تنگ موقع پر سودی قرض فوراً مل جاتا ہے اور اس کا کام چلتا رہتا ہے۔ یہ دروازہ بند ہو جائے تو نہ معلوم کتنی مرتبہ اس کا دیوالہ نکلنے کی نوبت آجائے۔ ایسا ہی معاملہ حکومتوں کا بھی ہے کہ ان کی ضرورتیں سودی قرض ہی سے پوری ہوتی رہتی ہیں، ورنہ کروڑوں روپے فراہم کرنے والے سخی داتا آخر انہیں روز روز کہاں مل سکتے ہیں۔

آیئے اب ہم ان میں سے ایک ایک "فائدے" اور "ضرورت" کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ آیا فی الحقیقت وہ کوئی فائدہ اور ضرورت ہے بھی یا یہ سب کچھ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے۔

اوّلین غلط فہمی یہ ہے کہ معاشی زندگی کے لئے افراد کی کفایت شعاری اور زراندوزی کو ایک ضروری اور مفید چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت ساری معاشی ترقی و خوشحالی منحصر ہے اس پر کہ جماعت بحیثیت مجموعی جتنا کچھ سامانِ زیست پیدا کرتی جائے وہ جلدی جلدی فروخت ہوتا چلا جائے تاکہ پیداوار اور اسکی کھپت کا چکر توازن کے ساتھ اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہے۔ یہ بات صرف اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ لوگ بالعموم اس امر کے عادی ہوں کہ معاشی سعی و عمل کے دوران میں جتنی کچھ دولت ان کے حصہ میں آئے اسے صرف کرتے رہیں اور اس قدر فراخ دل ہوں کہ اگر ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ دولت آگئی ہو تو اسے جماعت کے کم نصیب افراد کی طرف منتقل کر دیا کریں تاکہ وہ بھی بفراغت اپنے لئے ضروریاتِ زندگی خرید سکیں۔ مگر تم اس کے برعکس لوگوں کو یہ سکھاتے ہو کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت پہنچ گئی ہو وہ اسے روک رکھے اور جس کے پاس بقدرِ ضرورت دولت پہنچی ہو وہ بھی کنجوسی برت کر جسے تم ضبطِ نفس اور زہد اور قربانی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہو اپنی مناسب ضروریات کا ایک اچھا خاصا حصہ پورا کرنے سے باز رہے اور اس طرح ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی کوشش کرے۔ تمہارے نزدیک اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سرمایہ اکٹھا ہو کر صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے بہم پہنچ سکیگا۔ لیکن درحقیقت اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جو مال اس وقت بازار میں موجود ہے اس کا ایک بڑا حصہ یونہی پڑا رہ جائیگا۔ کیونکہ جن لوگوں کے اندر قوتِ خرید پہلے ہی کم تھی وہ تو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سا مال نہ خرید سکے اور جو بقدرِ ضرورت خرید سکتے تھے انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود پیداوار کا اچھا خاصہ حصہ نہ خریدا اور جن کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ قوتِ خریداری پہنچ گئی تھی انہوں نے بھی اُسے اپنے پاس روک کر رکھ لیا۔ اب اگر ہر معاشی چکر میں یہی ہوتا رہے کہ بقدرِ ضرورت اور زائد از ضرورت قوتِ خرید پانے والے لوگ اپنی اس قوت کے بڑے حصے کو نہ تو خود پیداوار کے خریدنے میں استعمال کریں نہ کم قوتِ خرید رکھنے والوں کو دیں، بلکہ اسے روکتے اور جمع کرتے چلے جائیں تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ ہر چکر میں جماعت کی معاشی پیداوار کا معتدبہ حصہ فروخت سے رکتا چلا جائے گا۔ مال کی کھپت کم ہونے سے روزگار میں کمی واقع

ہو گی۔ روزگار کی کمی آمدنیوں کی کمی پر منتج ہو گی۔ اور آمدنیوں کی کمی سے پھر اموالِ تجارت کی کھپت میں مزید کمی رونما ہوتی چلی جائیگی۔ اس طرح چند افراد کی زراندوزی بہت سے افراد کی بدحالی کا سبب بنے گی اور آخر کار یہ چیز خود ان زراندوز افراد کے لئے بھی وبالِ جان بن جائیگی، کیونکہ جس دولت کو وہ خریداری میں استعمال کرنے کے بجائے سمیٹ سمیٹ کر مزید پیداوار میں استعمال کریں گے آخر اس کے ذریعہ سے تیار کی ہوئی پیداوار کھپے گی کہاں؟

اس حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل معاشی ضرورت تو اُن اسباب اور محرکات کو دور کرنا ہے جن کی بنا پر افراد اپنی آمدنیوں کو خرچ کرنے کے بجائے روک رکھنے اور جمع کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ساری جماعت کی معاشی فلاح یہ چاہتی ہے کہ ایک طرف اجتماعی طور پر ایسے انتظامات کر دیئے جائیں جن کی بدولت ہر شخص کو اپنے برے وقت پر مالی مدد مل جایا کرے تاکہ لوگوں کو اپنی آمدنیاں جمع کرنے کی حاجت ہی نہ محسوس ہو، اور دوسری طرف جمع شدہ دولت پر زکوٰۃ عائد کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر جمع کرنے کا میلان کم ہو اور اس کے باوجود جو دولت رک جائے اس کا ایک حصہ بہرحال ان لوگوں تک پہنچتا رہے جنہوں نے گردشِ دولت میں سے کم حصہ پایا ہے۔ لیکن تم اس کے برعکس سود کا لالچ دے دے کر لوگوں کے طبعی بخل کو اور زیادہ اکساتے اور جو بخیل نہیں ہیں ان کو بھی یہ سکھاتے ہو کہ وہ خرچ کرنے کے بجائے مال جمع کریں۔

پھر اس غلط طریقے سے اجتماعی مفاد کے خلاف جو سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اسکو تم پیدائشِ دولت کے کاروبار کی طرف لاتے بھی ہو تو سود کے راستے سے لاتے ہو۔ یہ اجتماعی مفاد پر تمہارا ایک اور ظلم ہے۔ اگر یہ اکٹھی کی ہوئی دولت اس شرط پر کاروبار میں لگتی کہ جتنا کچھ منافع کاروبار میں ہوگا اس میں سے سرمایہ دار کو اس تناسب کے مطابق حصہ مل جائیگا تب بھی چنداں مضایقہ نہ تھا۔ مگر تم اسکو اس شرط پر لگاتے ہو کہ کاروبار میں چاہے منافع ہو یا نہ ہو اور چاہے کم منافع ہو یا زیادہ، بہرحال سرمایہ دار اس قدر فی صدی منافع ضرور پائے گا۔ اس طرح تم نے اجتماعی معیشت کو دوہرا نقصان پہنچایا۔ ایک نقصان وہ جو روپے کو خرچ نہ کرنے اور روک رکھنے سے پہنچا۔ اور دوسرا یہ کہ جو روپیہ روکا گیا تھا وہ اجتماعی معیشت کی طرف پلٹا بھی تو حصہ داری کے اصول پر کاروبار میں شریک نہیں ہوا بلکہ قرض بن کر پورے معاشرے کی صنعت و تجارت پر لد گیا اور تمہارے قانون نے اسکو یقینی منافع کی ضمانت دے دی اب تمہارے اس غلط نظام کی وجہ سے صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ معاشرے کے بکثرت افراد اُس قوتِ خریداری کو

جو انہیں حاصل ہوتی ہے، اجتماعی پیداوار کی خریداری میں صرف کرنے کے بجائے روک روک کر ایک سود طلب قرضے کی شکل میں معاشرے کے سر پر لادتے چلے جاتے ہیں۔ اور معاشرہ اس روز افزوں پیچیدگی میں مبتلا ہو گیا ہے کہ آخر وہ اس ہر لحظہ بڑھنے والے قرض و سود کو کس طرح ادا کرے جب کہ اِس سرمائے سے تیار کیے ہوئے مال کی کھپت بازار میں مشکل ہے اور مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمی اسے اس لئے نہیں خریدتے کہ ان کے پاس خریدنے کے لئے پیسہ نہیں۔ اور ہزارہا آدمی اسکو اس لئے نہیں خریدتے کہ وہ اپنی قوت خریداری کو مزید سود طلب قرض بنانے کے لئے روکتے چلے جا رہے ہیں۔

تم اس سود کا یہ فائدہ بتاتے ہو کہ اُس کے دباؤ کی وجہ سے کاروباری آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سرمائے کے فضول استعمال سے بچے اور اسکو زیادہ سے زیادہ نفع بخش طریقے سے استعمال کرے۔ تم شرحِ سود کی یہ کرامت بیان کرتے ہو کہ وہ خاموشی کے ساتھ کاروبار کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہتی ہے اور یہ اسی کا فیضان ہے کہ سرمایہ اپنے بہاؤ کے لئے تمام ممکن راستوں میں سے اُس کاروبار کے راستے کو چھانٹ لیتا ہے جو سب سے زیادہ نافع ہوتا ہے۔ لیکن ذرا اپنی اس سخن سازی کے پردے کو ہٹا کر دیکھو کہ اس کے نیچے اصل حقیقت کیا چھپی ہوئی ہے۔ دراصل سود نے پہلی خدمت تو یہ انجام دی کہ "فائدے" اور "منفعت" کی تمام دوسری تفسیریں اس کے فیض سے متروک ہو گئیں اور اِن الفاظ کا صرف ایک ہی مفہوم باقی رہ گیا، یعنی "مالی فائدہ" اور "مادی منفعت"۔ اس طرح سرمائے کو بڑی یکسوئی حاصل ہو گئی۔ پہلے وہ اُن راستوں کی طرف بھی چلا جایا کرتا تھا جن میں مالی فائدے کے سوا کسی اور قسم کا فائدہ ہوتا تھا۔ مگر اب وہ سیدھا اُن راستوں کا رُخ کرتا ہے جدھر مالی فائدے کا یقین ہوتا ہے۔ پھر دوسری خدمت وہ اپنی شرحِ خاص کے ذریعہ سے یہ انجام دیتا ہے کہ سرمائے کے مفید استعمال کا معیار سوسائٹی کا فائدہ نہیں بلکہ صرف سرمایہ دار کا فائدہ بن جاتا ہے۔ شرحِ سود یہ طے کر دیتی ہے کہ سرمایہ اُس کام میں صرف ہو گا جو مثلاً ۶ فی صدی سالانہ یا اس سے زیادہ منافع دے سکتا ہو۔ اس سے کم نفع دینے والا کوئی کام اس قابل نہیں ہے کہ اس پر مال صرف کیا جائے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک اسکیم سرمایہ کے سامنے یہ آتی ہے کہ ایسے مکانات تعمیر کئے جائیں جو آرام دہ بھی ہوں اور جنہیں غریب لوگ کم کرایہ پر لے سکیں۔ اور دوسری اسکیم یہ آتی ہے کہ ایک شاندار سنیما تعمیر کیا جائے۔ پہلی اسکیم ۶ فی صدی سے کم منافع کی امید دلاتی ہے اور دوسری اسکیم اس سے زیادہ نفع دیتی نظر آتی ہے۔

دوسرے حالات میں تو اس کا امکان تھا کہ سرمایہ نادانی "کے ساتھ پہلی اسکیم کی طرف بہ جاتا، یا کم از کم ان دونوں کے درمیان متردد ہو کر استخارہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتا۔ مگر یہ شرحِ سود کا فیضِ ہدائیت ہے کہ وہ سرمایہ کو بلا تامل دوسری اسکیم کا راستہ دکھا دیتا ہے اور پہلی اسکیم کو اس طرح پیچھے پھینکتا ہے کہ سرمایہ اسکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس پر مزید کرامت شرحِ سود میں یہ ہے کہ وہ کاروباری آدمی کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے منافع کو اس حد سے اوپر ہی اوپر رکھنے کی کوشش کرے جو سرمایہ دار نے کھینچ دی ہے، خواہ اس غرض کے لئے اسکو کیسے ہی غیر اخلاقی طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے ایک فلم کمپنی قائم کی ہے اور جو سرمایہ اس میں لگا ہوا ہے اسکی شرحِ سود ۶ فی صدی سالانہ ہے تو اسکو لامحالہ وہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جن سے اس کے کاروبار کا منافع ہر حال میں اس شرح سے زیادہ رہے۔ یہ بات اگر ایسے فلم تیار کرنے سے حاصل نہ ہو سکے جو اخلاقی حیثیت سے پاکیزہ اور علمی حیثیت سے مفید ہوں، تو وہ مجبور ہوگا کہ عریاں اور فحش کھیل تیار کرے اور ایسے ایسے طریقوں سے ان کا اشتہار دے جن سے عوام کے جذبات بھڑکیں اور وہ شہوانیت کے طوفان میں بہ کر اُس کے کھیل دیکھنے کے لئے جوق در جوق امنڈ آئیں۔

یہ ہے اُن فوائد کی حقیقت جو تمہارے نزدیک سود سے حاصل ہوتے ہیں اور جن کے حصول کا کوئی ذریعہ سود کے سوا نہیں ہے۔ اب ذرا اُس ضرورت کا جائزہ بھی لے لیجئے جو آپ کے نزدیک سود کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ قرض انسانی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔ اسکی ضرورت افراد کو اپنی شخصی حاجات میں بھی پیش آتی ہے، صنعت اور تجارت اور زراعت وغیرہ معاشی کاموں میں بھی ہر وقت اسکی مانگ رہتی ہے اور حکومت سمیت تمام اجتماعی ادارے بھی اس کے حاجتمند رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود کے بغیر قرض کی بہم رسانی غیر ممکن ہے۔ دراصل یہ صورتِ حال کہ افراد سے لے کر قوم تک کسی کو بھی ایک پیسہ بلا سود قرض نہیں ملتا، اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آپ نے سود کو قانوناً جائز کر رکھا ہے۔ اس کو حرام کیجئے اور معیشت کے ساتھ اخلاق کا بھی وہ نظام اختیار کیجئے جو اسلام نے تجویز کیا ہے، پھر آپ دیکھیں گے کہ شخصی حاجات، اور کاروبار، اور اجتماعی ضروریات، ہر چیز کے

لئے قرض بلاسود ملنا شروع ہوجائے گا، بلکہ عطیئے تک ملنے لگیں گے۔ اسلام عملاً اس کا ثبوت دے چکا ہے۔ صدیوں مسلمان سوسائٹی سود کے بغیر بہترین طریقہ پر اپنی معیشت کا سارا کام چلاتی رہی ہے۔ آپ کے اس منحوس دورِ سود خواری سے پہلے کبھی مسلمان سوسائٹی کا یہ حال نہیں رہا ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ اس لئے بے کفن پڑا رہ گیا ہو کہ اس کے وارث کو کہیں سے بلاسود قرض نہیں ملا، یا مسلمانوں کی صنعت و تجارت اور زراعت اس لئے بیٹھ گئی ہو کہ کاروباری ضروریات کے مطابق قرضِ حَسَن بہم پہنچانا غیر ممکن ثابت ہوا، یا مسلمان حکومتیں رفاہِ عام کے کاموں کے لئے اور جہاد کے لئے اس وجہ سے سرمایہ نہ پاسکی ہوں کہ ان کی قوم سود کے بغیر اپنی حکومت کو روپیہ دینے پر آمادہ نہ تھی۔ لہٰذا آپ کا یہ دعوٰے کہ قرضِ حسن ناقابلِ عمل ہے اور قرض و استقراض کی عمارت صرف سود ہی پر کھڑی ہوسکتی ہے، کسی منطقی تردید کا محتاج نہیں ہے، ہم اپنے صدیوں کے عمل سے اسے غلط ثابت کر چکے ہیں۔

یہ بحث کہ آج اس زمانے کی معاشی ضروریات کے لیئے قرض بلاسود کی بہم رسانی عملاً کس طرح ہوسکتی ہے، ہمارے اس باب کے موضوع سے خارج ہے۔ اس پر ہم بعد کے ایک باب میں گفتگو کریں گے:

"حیاتِ نو" ہفتہ وار حیدرآباد (دکن)

ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کا ممتاز داعی

حیاتِ نو تقریباً چار سال سے مسلسل دینِ حق کی اشاعت میں مصروف ہے ـــــ جنوری ۱۹۵۰ء سے شاندار صفحات، نئی ترتیب، اور نئے انتظامات کے تحت ٹائیٹل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

علمی مضامین، دلچسپ تنقیدیں، معیاری افسانے، بلند پایہ منظومات، ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کے تازہ کوائف، نئے اسلوب، شگفتہ ترتیب "حیاتِ نو" کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

چندہ سالانہ ۹ روپیہ ششماہی ۵ روپیہ سہ ماہی ۳ روپیہ فی پرچہ ۳ آنے

۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء تک خریدار بننے والوں کو سالانہ خریداری پر ایک روپیہ کی خاص رعایت کی جائے گی۔

دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

پتہ:۔ "حیاتِ نو" ہفتہ وار حیدرآباد دکن (انڈیا)